© rasailojaraid.com

نور محمد قریشی ایڈووکیٹ

بنیاد پرستی اور جہاد آزادی

میں یہ سطور روزنامہ ''خبریں'' مورخہ ۱۷ مارچ ۲۰۰۱ء میں شائع شدہ مضمون ''بنیاد پرستی تاریخ کے آئینہ میں'' سے تحریک پا کر لکھ رہا ہوں۔ یہ مضمون ''ڈان'' میں شائع شدہ کسی مضمون کا ترجمہ ہے جسے اے۔ بی۔ ایس جعفری صاحب نے لکھا ہے، موصوف فرماتے ہیں۔

''سب سے پہلے ہمیں اخلاقی جرأت کر کے اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ آزادی کی جدوجہد جو دس مارچ ۱۸۵۷ء سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے عرصہ پر محیط تھی۔ اس میں مولویوں اور علمائے دین کا کیا حصہ تھا''؟

موصوف نے بہت عمدہ سوال اٹھایا ہے یہ الگ بات ہے کہ یہ سوال دیر سے اٹھایا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سوال اٹھانے کی، اس سے قبل کسی نے جرأت ہی نہ کی ہو۔ واقعی ہمیں بحیثیت قوم کے تاریخی حقائق کو اس طرح دیکھنا چاہیے جس طرح کہ وہ ہیں نہ کہ اس طرح جس طرح ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زمان اپنے عمل کا حساب

(اقبالؒ)

میرے نزدیک ہمارے جہاد آزادی میں صرف علمائے کرام ہی نے حصہ لیا ہے۔ مسٹر صاحبان کا اس میں حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں کی آزادی کے دو ادوار ہیں۔ پہلا دور ۱۸۵۷ء سے شروع ہوتا ہے اور مارچ ۱۹۴۰ء پر ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا دور مارچ ۱۹۴۰ء سے شروع ہوتا ہے اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء پر ختم ہو جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں بھی علمائے کرام نے نمایاں حصہ لیا اور جب اس میں ناکامی ہوئی تو انہیں پھانسی اور حبس دوام کی سزائیں ہوئی اور چند ایک فرار ہو کر دوسرے ممالک میں چلے گئے۔ ہندوستان سے ہجرت کرنے والوں میں نمایاں نام مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی کی قیادت علمائے کرام ہی کر رہے تھے اور ان کا فرض بھی تھا کیونکہ انگریزوں کی آمد کے ساتھ وہ فلسفہ بھی چلا آ رہا تھا، جس نے انسان کو بندر کی ترقی یافتہ شکل قرار دے دیا تھا اور جس سے متاثر ہو کر مسٹر صاحبان نہ مسلمان رہے نہ مرتد۔ یعنی قلب ونظر سے تو مرتد ہو گئے لیکن علماء مسلمانوں میں شامل رہے وہ فرائض سے تو غافل ہو گئے لیکن مسلمان معاشرے سے اپنے حقوق برابر وصول کرتے رہے۔ جس کی ایک نمائندہ مثال جسٹس محمد منیر تھے۔ وہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے چیف جسٹس بنے۔ ان کا حال مرحوم الطاف گوہر نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح بیان کیا ہے۔

''مجھے خبر ملی کہ جسٹس منیر بیمار ہیں اور ان کے صحت یاب ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ میں عیادت کیلئے ان کے گھر گیا۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھا لیا باتیں کرتے کرتے انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ الطاف گوہر! تمہیں معلوم ہے کہ خدا کے وجود کے بارے میں میرے دل میں کئی سوال ہیں۔ موت کے بعد اگر میرا اللہ تعالیٰ سے سامنا ہوا تو میں کیا کروں گا۔؟ میں نے عرض کیا کہ آپ عمر بھر توہین عدالت کے مقدمات سنتے رہے ہیں۔ توہین عدالت کے مقدمہ کی سماعت اس وقت تک شروع نہیں ہوتی جب تک ملزم اپنے جرم کا اعتراف نہ کرے۔ آپ بھی یہی کیجئے خداوند کریم کے سامنے پیش ہوتے ہی اپنے جرم کا اعتراف کر لیجئے اور اپنے آپ کو خالق دو جہاں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیجئے وہ بڑا تواب الرحیم ہے۔ منیر صاحب کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ آپ نے میرا کندھا تھپتھپایا اور آنکھیں بند کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیں۔ چند روز بعد آپ وفات پا گئے'' ۔ ''گوہر گزشت'' از ''نوائے وقت'' ۲۹ اگست ۱۹۹۹ء

مسٹر صاحبان کی اکثریت کا یہی حال تھا الا ماشاء اللہ علمائے کرام نے ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز حکومت سے بغاوت کی ایک اور کوشش کی اس کے لئے انہوں نے جگہ کا انتخاب ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کا کیا اور باقاعدہ ہتھیار اٹھالئے لیکن اس کے لئے امداد پورے ہندوستان کے علماء کی طرف سے کی جارہی تھی۔ یہ ۶۴-۱۹۶۳ء کی بات ہے۔ یہ کوشش کچھ اپنوں کی غداری اور کچھ اپنی بے تدبیری سے ناکام ہوگئی اور علماء کرام کو پھانسی اور حبس دوام کی سزائیں ہوئیں۔ ان سزا پانے والوں میں مولانا محمد جعفر تھانیسریؒ بھی شامل تھے۔ سزا سنائے جانے کے بعد ان کے ساتھ کیا ہوا؟ وہ بیان کرتے ہیں۔ ''۲۲ فروری ۱۸۶۵ء کو ہم جیل لاہور کو روانہ ہوئے۔ جوگیانہ گیروالباس کالا کمبل اوڑھے ہوئے، بیڑی ہتھ کڑی کے زیور سے آراستہ پیراستہ ہم منزل در منزل اور کوچ در کوچ لاہور کو چلے جاتے تھے دو ایک گاڑیاں بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ بقدر تیس چالیس قیدیوں کے ہم جیل انبالہ سے روانہ ہوئے تھے۔ جب کوئی تھک جاتا تو اس کو گاڑی پر بھی سوار کر لیتے تھے ورنہ سب کے سب پاپیادہ خلخال کو چھن چھناتے چلے جاتے تھے۔ خیر سوا برس کے بعد جو ہم نے باہر کی ہوا کھائی تو طبیعت نہایت خوش تھی اور راستے میں جو چاہتے سو خرید کر کھاتے۔ اور مولوی یحییٰ علی صاحبؒ کی ہر دم مصاحبت میں رہے۔ اس سبب سے ہم کو تو اس سفر میں بھی دن عید اور رات شب برات ہوگئی تھی۔

ہم جو ایک مدت دراز کے بعد جیل کی تنگ تاریک کوٹھریوں سے باہر میدان میں پہنچے تو ہم ہرنوں کی طرح اڑے جاتے تھے جن جن قیدیوں کے پاس کچھ نقد تھا، ان کا جو کچھ جی چاہتا تھا راہ میں خرید کر کھاتے اور خوشی مناتے چلے جاتے تھے۔ لدھیانہ، پھلور، جالندھر، امرتسر ہوتے ہوئے لاہور پہنچے۔ اخیر منزل پر لاہور میں شالا مار باغ کے سامنے ہر کسی نے اپنا اپنا من بھر کر جو چاہا سو کھایا۔ کیونکہ جیل میں جا کر تو سوائے معمولی کھانے کے اور چیزیں ملنی محال بلکہ جرم تھیں۔ قریب تین بجے شام کے ہم لوگ سنٹر جیل لاہور کے دروازہ پر پہنچے اور ہمارے چالان کے کل قیدی ایک قطار کر کے دروازہ جیل پر بٹھلا دیے گئے۔ اول ایک کشمیری ہندو داروغہ آیا تھا اس نے پہلے ہمارے مقدمہ والوں کو بغور تمام دیکھا اور کسی قدر افسوس بھی کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر گرے صاحب سپرنٹنڈنٹ جیل رونق افروز ہوئے۔ انہوں نے سب سے اول ہم لوگوں کا ملاحظہ کیا اور بڑے غصہ سے حکم دیا کہ ایک ایک آڑا ڈنڈا ابھی ان لوگوں کے پاؤں میں ڈال دو۔ چنانچہ بمجرد صدور اس حکم کے لوہار ڈنڈے آہنی لے کر حاضر ہوگئے اور ہمارے دونوں پاؤں کے دونوں کڑوں کے درمیان سے ایک ایک آڑا ڈنڈا جو ایک فٹ (۵ گرہ) سے زیادہ لمبا نہ تھا ڈال دیا گیا۔ یہ حکم از راہ تعصب فقط ہم ہی لوگوں کے واسطے تھا اور تمام جیل بھر میں ہم نے کسی اور قیدی کے پاؤں میں یہ ڈنڈا نہیں دیکھا چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا نہایت مشکل ہوگیا۔ اور رات کو پاؤں پسار کر سونا بھی محال تھا'' ۔ ماخوذ از ''کالا پانی''

اپنے سفر کے اگلے مرحلہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔

''اخیر اکتوبر ۱۸۶۵ء میں ایک بڑا بھاری چالان قیدیوں کا تیار ہو کر ملتان کو روانہ کرنے کا بندوبست ہوا۔ ایک ایک ہتھکڑی دو دو آدمیوں کے ہاتھوں میں لگائی گئی۔ میرے ساتھی نے مجھ سے یہ رعایت کی کہ میرا بایاں اور اپنا دایاں ہاتھ ہتھکڑی میں ڈلوایا۔ ہمارے مقدمے کے فقط تین آدمی یعنی میں اور مولوی یحییٰ علی صاحبؒ اور میاں عبدالغفار صاحب ملتان کو روانہ ہوئے۔ جس دن ہم لاہور سے روانہ ہوئے ریل کے اسٹیشن تک پاؤں میں بیڑی سر پر بسترہ جس کو ایک ہاتھ سے تھامے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں ہتھکڑی کی گلچوٹ اس پر سپاہیوں کی مار مار کہ جلدی چلو جلدی چلو، ریل چلی جائے گی۔ خیر بہر صورت ہم ریل تک پہنچے وہاں جا کر ریل کی کوٹھڑیوں میں ہم کو بند کر کے قفل لگا دیا اور لاہور سے ملتان تک راہ میں کہیں نہ کھولا مثل جانوروں یا مال گاڑیوں میں بھر دیا تھا۔ کوئی آٹھ بجے رات کے بعد ہم ملتان پہنچے وہاں بھی اندھیری رات میں سر پر بستر رکھے ہوئے کشاں کشاں اسٹیشن سے جیل تک پہنچے جہاں بے آب و دانہ مثل جانوروں کے رات کو بند کر دیے گئے۔ دو دن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم جیل ملتان میں رہے۔ شہر کدھر بستا ہے؟ بازار کہاں ہے؟ وہ ہم نے آنکھ سے نہیں دیکھا۔ دو روز بعد وہاں سے لے جا کر ایک پتن یا گھاٹ دریائے سندھ پر جو ملتان سے قریب پانچ کوس ہے۔ ہم کو اگنبوٹ پر سوار کرایا۔ سوار کرانے کے بعد ہم سب کو قطار قطار کر کے اس پر بٹھلا دیا اور سوائے بیڑی ہتھکڑی اور ڈنڈے کے جو پہلے سے زیب تن تھے یہاں ایک بڑی موٹی زنجیر آہنی بھی بیڑیوں کے بیچ میں پھنسائی گئی کہ جس سے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے پاخانہ پیشاب کرتے رہے اس وقت قریباً آدھا آدھا من کے لوہا ہمارے جسم پر تھا۔ باوجود اس قدر کثرت پانی کے کہ دریائے سندھ ہمارے زیر پا تھا ہم پڑے پڑے تیمم سے نماز پڑھتے تھے گو ہم جکڑے ہوئے پڑے تھے مگر جیل سے نکل کر اور دوستوں کی مصاحبت اور آب دریا کی روانی اور آس پاس کے جنگلوں کی سبزی دیکھ کر بہت بشاش تھے۔ اس کیفیت سے پانچ چھ روز بعد ہم کوٹلی پہنچ گئے۔ سکھر بھکر اور ٹھٹھے کا نامی قلعہ بھی ہم کو راہ میں سندھ کے کنارے پر ملا۔ کوٹلی کے سامنے دوسرے کنارہ دریائے سندھ پر حیدرآباد سندھ کی نامی بستی بھی دیکھنے میں آئی۔ کوٹلی سے اسی دن ریل میں سوار ہو کر ہم کراچی پہنچ گئے"۔ ماخوذ از "کالا پانی"

گیارہ ماہ میں مولانا جعفر تھانیسری صاحبؒ ان کے ساتھی مولانا یحییٰ علی صاحبؒ ایک پر مشقت سفر کے بعد بالآخر جنوری ۱۸۶۶ء میں پورٹ بلیر انڈیمان پہنچ گئے۔ جہاں مولانا احمد اللہ صاحبؒ اور جرم بغاوت میں گرفتار دیگر ساتھی پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ ان باغیوں میں کوئی بھی مسٹر نہیں تھا۔ سب مولوی ہی تھے۔

بیسوی صدی کے شروع میں علمائے کرام نے انگریز سے نجات کے لئے ایک اور کوشش کی۔ یہ تحریک ریشمی رومال تھی۔ یہ تحریک بھی کچھ اپنی بے تدبیری اور کچھ اپنوں کی غداری کی وجہ سے ناکام ہوگئی۔ تمام کارکن گرفتار ہو گئے اور لمبی سزاؤں کے سزاوار ٹھہرے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اگرچہ فرار ہو کر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تھے لیکن شریف مکہ نے انگریزی حکومت کی استدعا پر انہیں گرفتار کروا دیا اور وہ کئی سال جزیرہ مالٹا میں قید رہے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے بھی ساری جوانی ملک ملک پھرنے میں گزار دی اور بڑھاپے میں واپس آئے۔

بہرحال انگریزوں کو ہندوستان سے بے دخل کرنے کی جتنی بھی کوششیں کی گئیں مسلمانوں میں سے وہ تمام کی تمام علمائے کرام کی طرف سے ہی کی گئیں، کسی مسٹر کا اس میں کوئی حصہ نظر نہیں آتا۔ مسٹر صاحبان تو اس دوران میں پوری کوشش کرتے رہے کہ اگر رنگ کے لحاظ سے نہیں تو دیگر ہر لحاظ سے وہ انگریز بن جائیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں انگریزوں نے اس لئے ترقی کی تھی کہ وہ بائیں سے دائیں کو لکھتے تھے۔ کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے۔ بائیں ہاتھ سے کھاتے تھے اور استنجا میں پانی کا استعمال نہیں کرتے تھے۔

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ شروع ہوئی تو یہ واضح ہو گیا تھا کہ انگریز اس جنگ میں کامیاب ہوں یا ناکام جنگ کے بعد انہیں ہندوستان سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ اب ہماری آزادی کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ جب یہ بات تقریباً طے ہوگئی کہ جنگ کے بعد ہندوستان آزاد ہو جائیگا تو ہم نے یہ مطالبہ کر دیا کہ انگریز اگر جانا چاہتے ہیں تو ہندوستان تقسیم کر کے جائیں۔ اس مطالبہ کے اندر یہ بات مخفی تھی کہ انگریز اگر مزید سو سال بھی یہاں حکومت کرنا چاہتے ہوں تو کرتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مطالبہ سے انگریز کو کیا تکلیف ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم ہند کا مطالبہ کرنے والوں نے جیل کا پھاٹک بھی نہیں دیکھا۔ جبکہ مجاہدین آزادی کی آدھی آدھی عمر جیل میں گزر گئی۔ جب مجاہدین آزادی جیلیں کاٹ رہے تھے اور انگریز کی عدالتوں میں اپنا دفاع بھی نہیں کر رہے تھے۔ ہمارے ہیرو انہیں عدالتوں میں اپنی وکالتوں کے جوہر دکھا دکھا کر مال بنا رہے تھے۔ یہ درست ہے کہ انگریز ہندوستان کو متحد حالت میں چھوڑ کر جانا چاہتے تھے کیونکہ تاریخ میں پہلی دفعہ انگریزوں نے ہندوستان کو طورخم سے راس کماری تک اور کوئٹہ سے برما کے بارڈر تک ایک سیاسی وحدت بنا دیا تھا۔ لیکن یہ صرف ایک جذباتی خواہش ہی تھی۔ چنانچہ جب ہندوستان ایک سے دو ملک بن گیا تو انگریزوں کی صحت پر کیا اثر ہوا اور جب دو سے تین ملک بن گیا تو بھی انہوں نے نہیں پوچھا کہ بھیا کیسی ہے اگر ہندوستان تین حصوں [illegible] بھی تقسیم ہو جاتا تو انگریز [illegible] کی بلا سے۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم ہند کا مطالبہ کرنے والوں کا تو کبھی لباس بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میلا نہیں ہوا تھا۔ آزادی کے لئے کوئی صعوبت اٹھانا تو بہت دور کی بات ہے۔

یہ درست ہے کہ مولانا آزادؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور دیگر علمائے کرام جنہوں نے آزادی کے لئے اپنی آدھی سے زیادہ زندگی جیل میں گزاری تھی۔ تقسیم ہند کے مخالف تھے، لیکن کیوں؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ان لوگوں کے مقابلہ میں قائداعظم، لیاقت علی خان، حسین شہید سہروردی، چوہدری خلیق الزمان، نواب افتخار حسین ممدوٹ، ممتاز دولتانہ، ایوب کھوڑو اسلام کا علم بھی زیادہ رکھتے ہوں اور مسلمانوں کے ہمدرد بھی زیادہ ہوں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ سب اکابرین جو عقل سے پیدل بھی نہ تھے اور آزادی کے لئے سختیاں بھی برداشت کر چکے تھے۔ تقسیم ہند کے مخالف تھے؟ میں نے تحریک پاکستان کو دیکھا نہیں، کتابوں میں پڑھا ہے۔ البتہ تقسیم ہند کا مجھے ہوش ہے۔ میں نے ان لوگوں کے نقطہ نظر سے مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ تقسیم ہند کی تجویز غالباً ان کو اس لئے اپیل نہ کر سکی کہ:۔

(1) اس تجویز کے اندر یہ بات مضمر تھی کہ اسلام اپنی قوت تاثیر کھو چکا ہے لہٰذا ہندوستان میں مسلمان اب قیامت تک اقلیت میں رہیں گے۔ اس لئے جہاں جہاں اتفاق سے مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ان علاقوں کو انگریزوں سے علیحدہ کروا لیا جائے۔ یہ ایسی بات ہے جو کوئی بھی مسلمان بہ سلامتی ایمان و بقائمی ہوش و حواس تسلیم نہیں کر سکتا۔ اسلام میں آج بھی وہی قوت تاثیر ہے، جو پہلی صدی ہجری میں تھی۔ قصور اگر ہے تو ہم سب کا ہے جو اسلام کی نمائندگی کر رہے ہیں۔

(2) اس تجویز کے اندر یہ بات بھی مضمر تھی کہ مسلمان جب ان علاقوں پر حکومت کرتے رہے جہاں ان کی اکثریت نہیں تھی تو وہ ظلم کرتے رہے۔ اسے بھی کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس تسلیم نہیں کر سکتا۔ میرے نزدیک تو انگریز بھی اگر ہندوستان پر حکومت کرتے رہے تو وہ کوئی ظلم نہیں کرتے رہے۔ مسلمانوں میں جب تک جوہر تھا وہ حکومت کرتے رہے لیکن جب انہوں نے حکمرانی کی صفات کھو دیں تو غلام ہو گئے۔ انہوں نے تو غلام ہونا ہی تھا۔ انگریزوں کے نہ ہوتے تو کسی اور کے ہو جاتے۔ احمد شاہ ابدالی نے اگر مرہٹوں کی کمر نہ توڑ دی ہوتی تو مسلمان انگریز سے بھی پہلے ہندو کے غلام ہو جاتے۔ چونکہ قیام پاکستان کے بعد بھی ہم نے اپنے اندر وہ جوہر پیدا نہیں کیے جو آزاد اقوام کا خاصہ ہوتے ہیں تو ہم پھر سے غلام ہو گئے ہیں اور یہ غلامی آئی۔ ایم۔ ایف اور عالمی بنک کی ہے۔ جیسے ہی ان لوگوں کی طرف سے کوئی ہدایت آتی ہے، ہماری پوری حکومت اس کی تعمیل میں لگ جاتی ہے بلکہ ہمارا وزیر خزانہ تو ہوتا ہی ان کا نمائندہ ہے۔

(3) ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پاکستان کے لئے جو قیمت ادا کی گئی اس قیمت پر تو اگر پورا برصغیر بھی پاکستان بن رہا ہوتا تو ایک غیرت مند مسلمان کو قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو جس طرح ذبح کیا گیا اور مسلمان عورتوں کو جس پیمانے پر بے آبرو کیا گیا۔ تاریخ میں اس سے قبل اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔ ہر انصاف پسند شخص سے سوال ہے کہ کیا ہماری قیادت کو اندازہ تھا کہ مشرقی پنجاب میں ہمارے ساتھ یہ ہوگا؟ اگر اندازہ تھا تو اس کا تدارک کرنے کے لئے انہوں نے کیا بندوبست کیا؟ اور اگر اندازہ نہیں تھا تو ان سے زیادہ بے بصیرت کوئی نہیں ہو سکتا۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ تقسیم ہند کا مطالبہ تو ہم نے انگریز سے کیا۔ اس کی مخالفت اگر کوئی کر رہا تھا تو وہ ہندو تھا لیکن بیٹیاں ہماری سکھ اٹھا کر لے گئے۔ سکھ توحید پرست ہیں، ان کی عبادت گاہ میں بت نہیں ہوتے جس طرح کہ ہندو مندروں میں ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے سکھ مسلمانوں کے زیادہ قریب ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ مرتد قادیانی ظفر اللہ کی پاکستان کے لئے کیا خدمات تھیں کہ اسے پاکستان کا وزیر خارجہ بنا دیا گیا جوگندر ناتھ منڈل کی کیا خدمات تھیں کہ اسے مرکزی کابینہ میں وزیر بنا دیا گیا۔ (یہ شخص وزارت سے استعفیٰ دیئے بغیر ہی ہندوستان چلا گیا تھا اور وہاں کی شہریت اختیار کر لی تھی) اگر چوہدری ظفر اللہ جیسے مرتد کو اور منڈل جیسے مشرک ہندو کو وزیر بنایا جا سکتا تھا تو ماسٹر تارا سنگھ کو کیوں وزیر نہیں بنایا جا سکتا تھا؟ اس طرح ہم اس تباہی سے تو بچ سکتے تھے۔ جس سے ہم مشرقی پنجاب سے دوچار ہوئے۔ برصغیر ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہوا اور فلسطین ۱۹۴۸ء میں تقسیم ہوا۔ دونوں جگہ انگریز حکمران تھے۔ ہاں تقسیم ہوئی۔ جب فلسطین کی تقسیم ... اسرائیل کے قیام کا اصولی فیصلہ ہو گیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو اردگرد کی عرب ریاستوں سے اعلان کر دیا کہ جونہی اسرائیل کے قیام کا اعلان ہوگا وہ اس پر حملہ دیں گے۔ چنانچہ انگریز انتقال اقتدار میں تاخیر کرنے لگ گئے تا کہ یہودی قیادت مناسب تیاری کر سکے۔ یہودی قیادت کو جب تاخیر کی وجہ معلوم ہوئی تو انہوں نے انگریز حکمرانوں سے کہا کہ آپ اقتدار منتقل کر کے رخصت ہوں اس کے بعد ہم جانیں اور عرب ممالک چنانچہ جوں ہی اسرائیل کے قیام کا اعلان ہوا تمام پڑوسی عرب ممالک نے اسرائیل پر حملہ کر دیا اور اسرائیل نے تمام حملے نہ صرف پسپا کیے بلکہ عرب ممالک کی افواج کی کافی ٹھکائی کی۔ یہ ہوتی ہے پیش بینی اور منصوبہ بندی۔ میرا سوال یہ ہے کہ ہماری قیادت نے کیا تیاری تھی کہ اگر مسلمانوں کو وہ پورا علاقہ نہ ملا جس کا وہ دعویٰ کر رہے تھے تو وہ اس کا تدارک کس طرح کریں گے اگر انگریز پاکستان کی سرحد اٹک کے پل کو بنا دیتے تو کیا ہماری قیادت ہتھیار اٹھا لیتی؟ یہ تو انگریز کی مہربانی ہے کہ اس نے آدھے سے زیادہ پنجاب پاکستان کو دے دیا ورنہ ہم کیا کر لیتے۔ ابتدائی اعلان کے مطابق فیروز پور ہیڈ ورکس پاکستان میں شامل ہو گیا تو وہ اپنی ریاست کا الحاق پاکستان سے کر دے گا نہرو اسی وقت ماؤنٹ بیٹن کے پاس گیا اور ماؤنٹ بیٹن نے نقشہ پر لکیر کو ٹیڑھا کر کے فیروز پور ہیڈ ورکس کو ہندوستان میں شامل کر دیا تو ہماری قیادت نے اس پر کیا کر لیا۔ اس پورے دور میں ہماری قیادت کا طرز عمل تو یہ نظر آتا ہے کہ دے جا سخیا راہ خدا۔ تیرا اللہ ہی بوٹا لائے گا۔

آزادی حاصل کرنے والی قیادت کا یہ حال نہیں ہوتا۔ انہیں اگر آزادی مذاکرات کی میز پر نہ ملے تو وہ بندوق کے زور سے حاصل کر لیا کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ جو مل گیا اسے صبر شکر کے ساتھ قبول کر لیا۔ بہر حال ہندوستان تقسیم ہو گیا اور پاکستان بن گیا ا،ر ہماری قیادت کا کمال یہ ہے کہ اس پوری جدوجہد میں اس نے اپنے کالر کو بھی میلا نہیں ہونے دیا۔ قربانی تو بہت دور بہت ہی دور کی بات ہے۔

پاکستان بننے کے بعد سے آج تک مسٹر صاحبان ہی اس کے حکمران رہے ہیں، اس ملک کا جو حشر کیا گیا ہے اس پر بات نہ ہی کی جائے تو بہتر ہے۔ انگریز نے جب برصغیر میں ریل بچھانی شروع کی تھی تو ان کی رفتار ایک ہزار میل فی سال تھی۔ پاکستان کے حصے میں جو ریل آئی تھی اس کا جو حال ہم نے کیا ہے وہ سب کو معلوم ہے ہم تو اس کی مناسب دیکھ بھال بھی نہ کر سکے اس میں اضافہ تو کیا کرنا تھا ملک تو بہر حال ریلوے سے زیادہ بڑا ادارہ ہوتا ہے خواہ کتنا ہی چھوٹا ملک کیوں نہ ہو۔ مسٹر صاحبان کے طفیل ہی ہم پر ایک ناکام ریاست کی پھبتی کسی جاتی ہے۔ آج تک کوئی مولوی تو اس ملک کا حکمران نہیں رہا۔ مسٹر صاحبان نے حال یہ کر دیا ہے کہ کشکول گدائی ہاتھ میں ہے۔ سیاسی میدان میں ہم نے اس ملک کو تجربہ گاہ بنا دیا ہے۔ کبھی ہم پارلیمانی نظام لاتے ہیں تو کبھی صدارتی۔ اور کبھی مارشل لا اور پھر پالیمانی تین تو ہم اس کے دستور بنا چکے ہیں۔ جس بھونڈے طریقے سے ہم نے مشرقی پاکستان کو علیحدہ کیا ہے، اس پر تو ڈوب کے مرجانا چاہیے۔ بے حسی کا عالم یہ ہے کہ ۱۹۷۲ء سے لاکھوں پاکستانی بنگلہ دیش کے کیمپوں میں پڑے ہیں اور ہم انہیں پاکستان نہیں لا رہے۔ ہم انہیں اس بات کی سزا دے رہے ہیں کہ انہوں نے ۱۹۴۵ء میں پاکستان کو ووٹ کیوں دیا تھا۔ سنگاپور اور ملائشیا میں بھی علیحدگی ہوئی ہے اور کسی کو یہ بھی یاد نہیں کہ وہ کب ایک سے دو ملک بن گئے۔ ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ۔ ۱۹۸۳ء میں مجھے امریکہ جانے کا اتفاق ہوا وہاں ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ پاکستان میں مارشل لا کیوں نافذ ہے؟ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ آج بھی یہ سوال موجود ہے کہ پاکستان میں فوج کی حکومت کیوں ہے؟ اب پانی کا قحط سامنے ہے۔ پنجاب کے تین دریاؤں سے ہم اسطرح دستبردار ہو گئے جیسے کوئی باپ کی وراثت سے دستبردار ہو جاتا ہے اگر دستبردار نہ ہوتے تو بھی کیا فرق پڑتا۔ ہم کشمیر سے دستبردار نہیں ہوئے تو کونسا کشمیر ہمیں مل گیا۔

بایں ہمہ میں پاکستان کے بارے میں بہت پر امید ہوں۔ پاکستان مشیت ایزدی کا فیصلہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے تاریخ عالم میں اس کا کوئی کردار رکھا ہوا ہے۔ یہ اتفاق کی پیداوار نہیں۔ روس کی افواج قاہرہ جب افغانستان میں داخل ہوئیں تو پاکستان کا اس کے پڑوس میں ہونا

© rasailojaraid.com